بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ذرا چشم تصور کھول کر انسانیت کی خوش بختی کا اس حال میں جائزہ لیجیے اگر بعد میں آنے والی ہر نسل پیشرو نسل کی کوتاہیوں اور خامیوں کو سامنے رکھ کر پیہم اصلاحِ احوال کی کوشش کرتی چلی جاتی اور ان لغزشوں سے بچنے کے لیے سعی کرتی جو اس سے پہلی نسل سے سرزد ہوئی تھیں۔ کیا اس صورت میں اللہ کی یہ زمین اس دنیا میں جنت کا نقشہ پیش نہ کرتی؟ اسے نوعِ بشری کی تیرہ بختی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہر دور کا انسان اپنی ایجادات اور اکتشافات میں، اپنے صنعتی اور فنی کمالات میں یا دوسرے لفظوں میں مادی ترقی کے مختلف شعبوں میں اپنے پیشروؤں کی کاوشوں سے بھرپور فائدہ اُٹھاتا ہے اور اُن کی کامرانیوں اور ناکامیوں کو نگاہ میں رکھ کر اپنی جدوجہد کے لیے ایسے خطوط متعین کرتا ہے جن سے اس کے قدم آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں لیکن وہی انسان جب اخلاقی اور معاشرتی دائرے میں سرگرم عمل ہوتا ہے تو ماضی کے سارے تجربات یکسر فراموش کر کے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے کام کا آغاز کرتا ہے۔ تاریخ کی کوئی اچھی سی کتاب لے کر گزری ہوئی اقوام کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کا شاید سب سے بڑا المیہ ہی یہی ہے کہ ہر آنے والی نسل اس بات کا تہیہ کر کے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے کہ اسے مذہب، اخلاق اور معاشرتی زندگی میں اپنے پیشروؤں سے قطعاً کوئی کسبی حاصل نہیں کرنا بلکہ جن گمراہیوں میں وہ گرفتار ہوئے ہیں اُن میں اُسے لازمی طور پر اپنے آپ کو گرفتار کرنا ہے، جو ٹھوکریں انہوں نے کھائی ہیں وہ بہرطور اسے بھی کھانی ہیں اور ضلالت و گمراہی کے جن مہیب غاروں میں وہ گرے ہیں اُن میں بہرحال اسے بھی گرنا ہے نیکی اور بھلائی، ہمت اور ایثار، جفاکشی اور جذبہ تعاون میں اگر اس کے قدم گزرے ہوئے لوگوں سے پیچھے رہ جائیں تو اُسے اس بات کا کوئی غم نہیں مگر اُسے یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہیں کہ خدا فراموشی، دنیا پرستی، بداخلاقی، مکر و فریب الغرض وہ سارے معائب جو انسانیت کو بلندی کی طرف نہیں بلکہ پستی کی طرف لیجانے والے ہیں، اُن میں وہ اپنے پیشروؤں سے کسی طرح پیچھے رہ جائے۔

انسانیت کے اس حوصلہ شکن طرزِ عمل نے بحیثیت مجموعی انسان کو انتہائی پریشان اور مایوس کر دیا ہے۔ وہ ایک طرف یہ دیکھتا ہے کہ انسان پہلے کی نسبت زیادہ مالدار اور مادی وسائل کے اعتبار سے زیادہ آسودہ حال ہے۔ برق و بخارات سے کام لے کر اُس نے اشیاء کی پیداوار میں محیر العقول اضافہ کیا ہے اور ان کی مدد ہی سے اس نے دُنیا کے دُور دراز گوشے سمیٹ کر کرۂ ارض کو ایک مختصر سی اکائی بنا کر رکھ دیا ہے اور اب اس کی تنگ دامانی سے نکل کر افلاک کی بے پایاں وسعتوں کو اپنے تصرف میں لانے کے درپے ہے۔ اس کی کامرانی اور ظفرمندی کا ایک یہ رُخ ہے مگر دوسری طرف اس کی زبوں حالی کا یہ عالم ہے کہ برق رفتاری کے ساتھ ہوا میں اُڑنے والا انسان جو چند ساعتوں کے اندر زمین کے مدار سے باآسانی باہر نکل کر چاند کی طرف کامیابی سے پرواز کر سکتا ہے وہ کسی ایسی بُرائی کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتا جو پہلی نسلوں میں کسی صورت میں موجود تھی۔ اگر گزری ہوئی قوموں میں فرعون اور نمرود کی صورت میں خدا کے باغی پیدا ہوئے تو آج بلا مبالغہ انسانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد فرعون اور نمرود کا طرزِ عمل اختیار کیے ہوئے ہے اور ان کی نسبت زیادہ ڈھٹائی کے ساتھ خدا سے بغاوت کی روش اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ اگر ماضی میں ظلم و استبداد، زیردست آزاری اور اخلاقی حدود و قیود کو پامال کرنے کی وجہ سے مختلف قومیں تباہ ہوئیں تو آج بھی انہی بُرائیوں کی وجہ سے قومیں ہلاکت کا شکار ہو رہی ہیں۔ لیکن نہ تو فرعون اور نمرود کا حشر دیکھ کر آجکل کے فراعنہ اور نمارده کو کوئی سبق حاصل ہوتا ہے اور نہ ظالم بستیوں کے حسرتناک انجام سے آجکل کی سفاک قومیں کوئی عبرت پکڑتی ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ لوہے کی ہر نئی مشین پہلی مشینوں سے بہتر اور ان کے نقائص سے پاک ہوتی ہے۔ لیکن "مٹی کی مشین" میں وہ سارے عیوب بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں جو سابقہ مشینوں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھے۔ کیا یہ صورتِ حال اس حقیقت کی شہادت نہیں دیتی کہ انسان ماضی کے واقعات سے سبق سیکھنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا۔

انسانیت کی اس دلفگار داستان کو دیکھتے ہوئے ذہن میں فطرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان کی اس ناکامی اور نامرادی کا سبب کیا ہے؟ اس کے یوں تو متعدد وجوہ ہیں مگر چار خاص طور پر بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ جنہیں اگر ایک فقرہ میں سمیٹ کر بیان کرنا مقصود ہو تو "اُسے اقتدار کی بدمستی کہا جا سکتا ہے"۔

یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ زندگی کے ہر مرحلہ پر اثباتِ ذات کے لیے کوشش کرتا ہے اور اس کی یہ کوشش انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی۔ اگر وہ اس راہ میں سعی و جہد ترک کر دے تو پھر اس کی

زندگی بالکل عبث اور بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس اثبات ذات میں وہ جہاں اپنے لیے ایک خاص مقام کے حصول کا حق منواتا ہے وہاں وہ اپنے فکر و عمل سے یہ بات بھی ثابت کرتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں پر تفوق اور برتری حاصل ہے۔ انسان کا یہ فطری داعیہ اگر اپنی مناسب حدود میں رہے اور ہر فرد تعمیری کوششوں اور اخلاق حسنہ کی بنا پر دوسرے انسان پر سبقت لے جانے کی کوشش کرے تو اس سے انسانیت کو بحیثیت مجموعی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور قدرت نے انسان کے اندر یہ جذبہ مسابقت اسی وجہ سے ودیعت کر رکھا ہے کہ اس سے اثباتِ ذات میں مدد ملتی ہے۔ لیکن انسان اس معقول اور تعمیری راستے کو چھوڑ کر غیر معقول، جابرانہ اور تخریبی راستوں سے دوسرے افراد پر تسلط حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور اس کا ایک عام اور سہل طریقہ یہ ہے کہ کسی طرح تختِ اقتدار پر قبضہ حاصل کر لیا جائے اور پھر اقتدار کی قوت سے اپنی خدائی کا جھوٹا سکہ چلا کر اپنی بپھری ہوئی انا کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ طریقہ اس لیے سب سے زیادہ آسان ہے کہ اس میں مکر و فریب اور اندھی بہری قوت کے علاوہ اور کوئی چیز صرف نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص روحانی اور اخلاقی مصلح کے طور پر دوسرے انسانوں میں نمایاں ہونے کا آرزومند ہو تو اسے اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ ریاضت کرنا پڑتی ہے اور پھر اس مقام کو حاصل کر لینے کے بعد اس پر فائز رہنے کے لیے اسے اپنے اخلاق کا ایک خاص معیار برقرار رکھنے کی غرض سے تزکیہ نفس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن سیاسی قوت کے حصول کے لیے اصلاح نفس کے لیے قطعاً کوئی کوشش درکار نہیں ہوتی بلکہ کوئی انسان جس قدر زیادہ بگڑا ہوا ہو اور دھوکہ دہی کے فن میں جس نسبت سے بیباک اور مشاق ہو اسی نسبت سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ ماضی میں جب بادشاہت وراثت کے طور پر ایک ہی خاندان میں ایک فرد سے دوسرے فرد کی طرف منتقل ہوتی رہتی تھی اور معاشرے کے عام افراد کے لیے تختِ اقتدار پر متمکن ہونا امرِ محال خیال کیا جاتا تھا تو اقتدار کے پجاری صرف یہی کچھ کر سکتے تھے کہ مختلف حیلوں بہانوں سے شاہ کے مصاحبین بن جائیں۔ جمہوریت کے اس دور میں چونکہ ہر ذہین آدمی اقتدار پر قابض ہو سکتا ہے اس لیے وہ بڑی جسارت کے ساتھ دلفریب نعروں، جھوٹے وعدوں، کذب اور دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے اور عوام کے جذبات سے کھیلتے ہوئے اُن کی گردنوں پر مسلط ہو جاتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ جو اقتدار ناپاک عزائم کی تکمیل کی خاطر ناپاک ذرائع سے حاصل ہو، اس پر قابض رہنے کے لیے بھی ناپاک ہتھکنڈے ہی استعمال کرنے پڑتے ہیں چنانچہ جھوٹ کے جس مذموم دھندے سے حصولِ اقتدار کی

جدوجہد شروع ہوتی ہے وہ کاروبارِ تخت اقتدار پر متمکن ہوجانے کے بعد کہیں زیادہ تیز ہوجاتا ہے اور اس کی ضرورت خاص طور پر اس لیے بھی پیش آتی ہے کہ جب تک ایک انسان اقتدار سے محروم رہتا ہے اسے یہ رعایت بہرحال حاصل ہوتی ہے کہ عوام اس کے خوش کن دعووں کے متعلق کسی قدر حسن ظن سے کام لیں اور نیک تمنائیں وابستہ کرتے ہوئے اس کے تسلط کو ملک اور قوم کے لیے اچھا شگون خیال کریں لیکن بلند بانگ دعوے کرنے والا وہی شخص جب عملاً مسندِ اقتدار پر براجمان ہوکر ملک کے سیاہ وسپید کا مالک بنتا ہے تو پھر اس کی آزمائش کا دور شروع ہوتا ہے اور اسے اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے دعاوی میں کس حد تک مخلص اور سچا ہے۔ اس کے یہ دعاوی چونکہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کا مقصد لوگوں کو فریب دینا ہوتا ہے اس لیے مسندِ اقتدار پر متمکن ہوتے ہی اس کی توجہ اس بات پر مبذول ہوجاتی ہے کہ وہ قوم کو دھوکے میں رکھ کر اس پر ایک طویل عرصے تک بلاشرکت غیرے مسلط رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت کے وسیع ذرائع ابلاغ کو کام میں لاتے ہوئے جھوٹ کی ایک نہایت منظم مہم کا آغاز ہوتا ہے۔ سرکاری اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن اور آقائے ولی نعمت کے دوسرے ثناخواں، حکمرانوں خصوصاً اس کے مرکزی کردار کے ایسے کارہائے نمایاں بیان کرتے ہیں جن سے عام تاثر یہی ملتا ہے کہ قوم کے سارے دکھوں کا بڑی تیزی کے ساتھ مداوا ہو رہا ہے، ملک سے افلاس مٹ رہا ہے، ظلم و استبداد دم توڑ رہا ہے، ناانصافیوں اور درازدستیوں کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے اور جو لوگ ان جرائم کا ارتکاب کر رہے تھے وہ کیفر کردار کو پہنچنے والے ہیں۔ حکومت اگرچہ اس قسم کے جھوٹے پراپیگنڈے پر کروڑوں روپے سالانہ صرف کرتی ہے مگر نتائج کے اعتبار سے یہ کسی طرح بھی مفید ثابت نہیں ہوتا بلکہ عوام کے اندر اس کے خلاف ایک شدید ردِعمل پیدا ہوتا ہے اور وہ اس نہج پر سوچنا شروع کردیتے ہیں کہ حکومت اپنی ناکامیوں کو مکروفریب کے ذریعے چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کسی فرد یا گروہ کے تخت نشین ہونے سے پیشتر تو لوگ اس کے دعاوی کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار ہوسکتے ہیں مگر عنانِ اختیار سنبھالنے کے بعد صحیح صورتِ حال کو محض الفاظ کی بازیگری سے چھپایا نہیں جاسکتا۔ چند افراد یا کسی گروہ کو تھوڑے سے وقت کے لیے دھوکہ دینا ممکن ہے لیکن پوری قوم کو ایک لمبے عرصہ تک بیوقوف بنانا امرمحال ہے۔ سخت ناداں ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ غربت اور افلاس کے شدائد اور سیاسی استبداد اور معاشی استحصال کے مصائب کو محض پراپیگنڈے کے ذریعہ مٹایا جاسکتا ہے۔ زندگی ایک ٹھوس حقیقت ہے اور یہ اپنے مسائل کے حل کے لیے ٹھوس اقدام کی ہی طالب ہوتی ہے اس لیے جو لوگ ٹھوس حقائق کا سامنا کرنے کے بجائے صرف الفاظ کی شعبدہ بازیوں اور دلفریب بیانات کی بھرمار سے عوام کو

اپنے دامِ فریب میں گرفتار رکھنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں انہیں جلد ہی اپنا انجام نظر آنے لگتا ہے مگر اقتدار کا نشہ اور اپنے غلط کار مشیروں کے غلط مشورے اور گرد و پیش میں کاسہ لیسوں کا ہجوم انہیں راہ راست پر آنے نہیں دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد اقتدار کو طول دینے کی غرض سے ہر اس آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں جو انہیں آنکھیں کھول کر حکومت چلانے کی دعوت دیتی ہے۔ فرمانرواؤں کا مزاج اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ وہ اختلاف کی کوئی معمولی آواز سننا بھی گوارا نہیں کرتے اور ملک میں بزعم خود ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں جس میں یا تو صرف اُن کی آواز گونجے یا پھر وہ آواز جس میں ان کی تعریف و توصیف کا رس گھلا ہو مگر زبان بندی کے یہ سارے حربے آج تک کسی صورت بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ نہ ماضی میں نہ حال میں کیونکہ یہ حربے اس نظامِ عدل کے خلاف ہیں جس پر یہ ساری کائنات قائم ہے۔ کوئی ظالم حکمران زبانوں پر تو پہرے بٹھا سکتا ہے لیکن وہ زخمی دلوں کی آہ و فغاں کو کس طرح دبا سکتا ہے۔ وہ پولیس کی مدد سے اس بات کا التزام تو کر سکتا ہے کہ لوگ سڑکوں پر نکل کر نالہ و فریاد کرنے سے گریز کریں مگر وہ نالے جو دل کے اندر شورش بپا کرنے والے اور آنکھوں سے ابل کر عوام کے کرب و اضطراب کو ظاہر کرنے والے ہیں اُن کے اثرات کو آخر کس طرح زائل کیا جا سکتا ہے۔ یہ عاقبت نا اندیش حکمران ہمیشہ اس غلط فہمی کا شکار رہے ہیں کہ لوگوں کی زبانوں پر اگر قدغن عائد کر دی جائے تو تخت و تاج اُن کی میراث بن سکتے ہیں۔ وہ شاید اقتدار کی مستی میں یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ بسا اوقات "خاموش گویائی" بالخصوص جب وہ محرومیوں کی المناک داستان سنا رہی ہو اور مجبوری اور بے بسی کی حسرتناک تصویر پیش کر رہی ہو، لمبی چوڑی تقریروں، خوشنما بیانات سے کہیں زیادہ اثر انگیز ثابت ہوتی ہے اور پوری قوم کے خفتہ احساسات کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ٹھوس حقیقت آمرانہ مزاج کے حامل فرمانرواؤں کی نظر سے ہمیشہ اوجھل ہی رہی ہے اور وہ اپنی اس غفلت کی وجہ سے خود اپنے آگے بھی کانٹے بوتے ہیں اور ملک و ملت کو بھی ہر دور میں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتے ہیں۔

تلخ حقائق کو نظر انداز کرنے سے اُن کی تلخی میں تو کوئی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ اُن کا سامنا کرنے میں جس قدر تساہل برتا جاتا ہے اُسی نسبت سے اُن کی سنگینی بڑھتی چلی جاتی ہے اور حکمرانوں کی پیہم غلطیوں کی وجہ سے یہی حقائق لاینحل مسائل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک فرمانروا اپنی آمریت کے قیام کی خاطر عوام کے جائز شہری حقوق سلب کرتا ہے۔ اس ناانصافی کا جو ردِ عمل عوام کے اندر ہوتا ہے وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن خود اس حکمران کو اپنی

اس ظالمانہ کارروائی کی تائید کے لیے سخت ناقابل اعتماد سہارے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ جو فرد یا گروہ کسی لالچ میں آکر پوری دنیا کے سامنے ناحق بات کی تائید کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے اور اس معاملے میں خدا اور خلق دونوں کے سامنے صریح جھوٹ بولتا ہے وہ کسی حکمران کے لیے کس حد تک مفید ثابت ہوسکتا ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ جو فرد اپنے آپ سے مخلص نہ ہو، جسے اپنے ضمیر اور ایمان کے خلاف بات کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہ ہوتی ہو، جو معمولی سے دنیوی فائدوں کے لیے ظلم کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوسکتا ہو اُسے آخر کس طرح بھروسے کے قابل سمجھا جاسکتا ہے اور جو شخص اس پر بھروسہ کرتا ہے کیا وہ اپنی بربادی کا سامان فراہم نہیں کرتا؟ ظالم حکمران جادۂ مستقیم سے ہٹ کر عوام پر جس نسبت سے دست ظلم دراز کرتے ہیں اسی نسبت سے وہ معاشرے کے بے ضمیر افراد کی تائید کے محتاج ہوتے ہیں تاکہ وہ ستمرانیوں کے حق میں کوئی آواز سُن سکیں۔ یہ اندوہناک صورتِ حال جب کچھ مدّت تک جاری رہتی ہے تو عملاً حکمران ٹولے میں وہ لوگ باقی رہ جاتے ہیں جو ضمیر، ایمان، حق پرستی اور اصول پسندی کی دولت سے محروم ہوتے ہیں اور صرف مادی مفادات کی خاطر تختِ اقتدار پر براجمان شخص سے اپنی عقیدت اور وابستگی کا اعلان کرتے پھرتے ہیں۔ یہ فریب خوردہ شخصیت کچھ عرصہ تک تو اس بات سے مسرور ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ "عقیدت مندوں" اور "جاں نثاروں" کی فوج ظفر موج موجود ہے مگر چند ماہ کے بعد ہی اسے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس کے یہ "فدائین" اس کے لیے کس طرح وبالِ جان بنتے جارہے ہیں۔ حکومت خواہ کتنے ہی وسیع ذرائع و وسائل کی مالک ہو مگر وہ اقتدار کے سارے "خیر خواہوں" کی ہر آن بڑھتی ہوئی خواہشات کو کماحقہ پورا نہیں کرسکتی۔ خصوصاً جب ان میں سے ہر "جاں نثار" مطالبات کی ایک طویل فہرست جیب میں لیے پھرتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سربراہ مملکت کے پرستار مطلوبہ مفادات حاصل نہ ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ اس کا ساتھ چھوڑ کر مخالف کیمپوں میں جا گھستے ہیں وہ چونکہ مملکت اور صاحبِ اقتدار اور اس کے یمین و یسار میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے اس کے محرم راز ہوتے ہیں اس لیے وہ حکومت کے ایوانوں میں بڑی تیزی کے ساتھ زلزلہ پیدا کرسکتے ہیں۔ حکمران طبقہ ان مخدوش حالات میں بھی سوچ سے کام نہیں لیتا بلکہ وہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ وابستگانِ اقتدار میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے کچھ دوسرے "جاں نثاروں" سے پُر کیا جائے۔ اس نازک مرحلے پر جب اقتدار کا سنگھاسن ڈول رہا ہو وہی لوگ لپک کر اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں جنہیں دنیوی مفادات کے علاوہ اس بات کی بھی فکر لاحق ہوتی ہے کہ اگر انہوں نے حکومت کا تحفظ حاصل نہ کیا تو اُن کے لیے آزادی کے ساتھ عوام کے اندر گھومنا پھرنا مشکل ہوجائے گا۔ چنانچہ وہ تغرّرات

سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو حکومت کا بھی خواہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن حکمرانوں کی فرمانروائی اس قسم کے آبرو باختہ لوگوں کی تائید کی محتاج ہو وہ آخر کتنے دن قائم رہ سکتی ہے اور وہ جتنے دن قائم رہے اس میں ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کر سکتی ہے۔ اس نوعیت کی حکمرانی تو ایک عذاب ہے جس کی لپیٹ میں حاکم و محکوم دونوں آجاتے ہیں۔ تاریخ کا ہر ورق اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے مگر ہر ظالم حکمران اس سے اغماض برتتا ہے۔

اقتدار کا دوسرا المیہ نوعیت کے اعتبار سے خدا اور آخرت سے غافل اس فاسق و فاجر کے طرزِ عمل سے ملتا جلتا ہے جو ہر روز اپنے سامنے لوگوں کے جنازے اُٹھتے دیکھتا ہے مگر اس کا کوئی اثر قبول نہیں کرتا، جو خود اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائی بندوں کو لحد میں اُتار کر انہیں منوں مٹی کے نیچے دباتا ہے مگر ان کی موت سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتا۔ وہ غالباً یہ سمجھ کر فسق و فجور میں مبتلا رہتا ہے کہ موت تو دوسرے لوگوں کا مقدر ہے اس کا مقدر نہیں۔ اسے ابدالآباد تک اس دنیا پر ہی رہنا ہے اور اس کے اس حق کو کوئی طاقت چھین نہیں سکتی۔ انسان کی غفلت کوشی کا سب سے دردانگیز پہلو یہ ہے کہ وہ ہر اس حقیقت کو جس کا وہ صبح و شام مشاہدہ کرتا ہے اور جو اس کے سب سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے اس پر سب سے زیادہ مؤثر طریق سے اثر انداز ہوتی ہے اس سے ہی صرف نظر کرتا ہے۔ انسانی زندگی میں موت سے زیادہ محسوس اور واضح حقیقت اور کونسی ہو سکتی ہے جس کے انکار کی کوئی شخص جرأت نہیں کر سکتا لیکن انسان اس حقیقت کو ماننے کے باوجود اسے عملاً جھٹلاتا ہے۔ اگر کوئی فرد دل کی گہرائیوں میں یہ بات تسلیم کرے کہ اُسے ایک دن موت کی آغوش میں پناہ لینا ہے اور اس سے مفر نہیں تو وہ اپنے خدا سے غافل ہو کر فسق و فجور کی زندگی بسر کرنے کی کیونکر جرأت کر سکتا ہے مگر لوگ اپنے حتمی انجام کو جاننے کے باوجود اپنے مالک سے بغاوت کا رویہ اس غلط فہمی کا شکار ہونے کی وجہ سے کرتے ہیں کہ موت سے دوسرے لوگوں کو ہی دوچار ہونا ہے، وہ اس کی گرفت میں کسی طرح نہیں آسکتے۔

بالکل یہی حال بگڑے ہوئے حکمران کا ہوتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اقتدار کی بے ثباتی دیکھتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو بخوبی جانتا ہے کہ جو شخص پہلے اس مسندِ اقتدار پر فائز تھا جس پر اب وہ قابض ہے، وہ اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں کس قسم کی خوش فہمیوں کا شکار تھا اور بالآخر اُس کا کیا (باقی بر صفحہ ۴۵)

(بقیہ اشارات) انجام ہوا۔ لیکن ان سب حقائق کے جاننے کے باوجود جو اُس کے سامنے سورج سے زیادہ روشن صورت میں موجود ہوتے ہیں وہ کوئی سبق حاصل نہیں کرتا۔ وہ مسند اقتدار پر بیٹھ کر ساری خرمستیاں اس باطل خیال کے تحت کرتا ہے کہ اگر دوسرے حکمرانوں کا اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے بُرا حشر ہوا ہے تو یہ بات صرف انہیں تک محدود ہے۔ اس کی ذات اپنی کوتاہیوں کے باوجود بُرے انجام سے بہرحال محفوظ رہے گی کیونکہ وہ جو ظلم اور زیادتی کر رہا ہے وہ قوم کی بہتری کے لیے کر رہا ہے اگر وہ عوام کے شہری حقوق سلب کرتا ہے تو اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ عوام حقوق کے چکروں سے نکل کر فرائض کی انجام دہی میں منہمک ہو جائیں، اگر وہ جمہوریت کا گلا گھونٹ کر عوام پر آمریت مسلط کرتا ہے تو اس کی غرض بھی صرف یہی ہوتی ہے کہ قوم رائے عامہ کی تیاری اور انتخابی سرگرمیوں میں اپنے اوقات اور صلاحیتیں کھپانے کے بجائے انہیں ملکی تعمیر کی راہ پر لگائیں۔ وہ عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی جو نمائشی کاموں میں صرف کرتا ہے تو اس سے عوام کو برہم نہ ہونا چاہیے کیونکہ اس میں بھی اُس کے پیش نظر ملکی وقار کا مسئلہ ہوتا ہے کہ کہیں دوسری قومیں اُس کے بارے میں یہ غلط تاثر قائم نہ کر لیں کہ وہ ایک غریب قوم کا غریب سربراہ ہے۔ اس ظالم اور ناانصاف حکمران کی عیارانہ باتیں ممکن ہے اقتدار کی مستی کی وجہ سے خود اُسے فریب نفس میں گرفتار کر دیں مگر دوسروں کے لیے یہ کسی اعتبار سے بھی قابل اطمینان نہیں ہوتیں۔ بداعمالیوں اور درازدستیوں کے حق میں یہ بھونڈے دلائل جابر حکمرانوں کے وقار کو سخت مجروح کرتے ہیں اور ملک کے اندر اور باہر اُن کے بارے میں یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ یہ حکمران نہ صرف سفاک، مردم آزار اور غیر مخلص ہیں بلکہ عقل و خرد سے بھی یکسر عاری ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ تخت اقتدار پر بیٹھ کر اس طرح کی احمقانہ حرکتیں کرنے والے اپنی ان حرکات کے ردّعمل اور اس سے پیدا ہونے والے تباہ کن نتائج سے بے پروا ہی رہتے ہیں اور ان پر اس وقت تک مدہوشی طاری رہتی ہے جب تک یہ تخت و تاج سے محروم نہیں ہو جاتے۔ اگر مسند اقتدار پر فائز رہتے ہوئے کوئی صاحب اختیار اپنے اعمال اور اس کے نتائج کو جانچنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ رہے تو اس سے انسانیت بے شمار ہلاکتوں سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ انسانیت کی یہ مخلصانہ آرزو، کہ جو سر تاج سے مزین ہے اس میں خود پسندی کا خناس موجود نہ ہو، آرزو ہی رہی ہے اور بہت کم صورتوں میں شرمندۂ تعبیر ہو سکی ہے۔ اگر انسانیت

کی یہ آرزو پوری ہو جاتی تو انسانی زندگی میں جبر و استبداد کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔ مسندِ عدل پر بیٹھ کر تو لوگوں نے انصاف کیا ہے لیکن تختِ اقتدار پر براجمان ہو کر اصحابِ اقتدار نے عوام کے ساتھ بالعموم ظلم اور زیادتی ہی کی ہے۔

تاریخ کا تیسرا بڑا المیہ یہ ہے جو طالع آزما عوام پر اپنی خدائی کے قیام کی خاطر حصولِ اقتدار کے لیے کوشاں ہوتے ہیں، وہ کسی مرحلے پر بھی کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس سے ملک و ملت کو حقیقی فائدہ حاصل ہو۔ لیکن وہ اپنی چالاکی اور عیاری سے تختِ اقتدار پر قابض ہونے سے پیشتر عوام کو یہی تاثر دیتے ہیں کہ اُن سے زیادہ ملک و ملت کا کوئی خیر خواہ نہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی قوم پریشان فکری، پریشان نظری اور ابلہ فریبی کا شکار ہوتی ہے اور بعد میں جبر و استبداد کی چکی میں پسنے کے علاوہ یاس و قنوطیت جیسے مہلک امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شخص یا گروہ قوم کے سامنے ٹھوس اور قابلِ تکمیل منصوبے پیش کر کے اُسے اپنے پیچھے لگائے تو اس کا یہ طرزِ عمل جہاں ایک طرف اس کے خلوص کو ظاہر کرتا ہے وہاں عوام کو بعد ازاں مایوس ہونے سے بھی بچاتا ہے۔ لیکن اگر اقتدار کا کوئی حریص قوم کے سامنے سپنوں کے محلات تعمیر کر کے اسے گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ ملک و ملت کی انتہائی بدنصیبی ہے کیونکہ عملی زندگی میں جب یہ طلسمات ٹوٹتے ہیں تو قوم پر افسردگی کا عالم طاری ہونے کے ساتھ اس کی ساری صلاحیتیں بھی ٹھٹھک کر رہ جاتی ہیں اور قوم کی حالت اُس حرماں نصیب باپ کی سی ہوتی ہے جو خود اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی اُمیدوں کے پیکر کو مرقد کے سپرد ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔

ذرا دُور نہ جائیے موجودہ حکمران جماعت اور اُس کے سربراہ کی تخت نشینی سے پہلے کی کارگزاریوں پر ایک نگاہ ڈالیے تو آپ کو اس المیے، جسے قنوطیت کا المیہ کہا جا سکتا ہے، کی شدت کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ قوم کی تعمیر کے لیے فکری یکسوئی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے کسی قوم کا حقیقی بہی خواہ سب سے پہلے اس بات کی فکر کرتا ہے کہ قوم کو فکری انتشار سے بچا کر اُسے نصب العین کے معاملے میں یکسو کیا جائے لیکن یہاں چونکہ اصل مقصد جائز و ناجائز طریق سے اس کی گردن پر مسلط ہونا تھا اس لیے اس کے اندر فکر و نظر کا خوفناک انتشار پیدا کیا گیا اور وہ بیچاری اگر پہلے اپنے بعض مقاصد کے معاملے میں یکسو بھی تھی تو اس یکسوئی

کو توڑ کر اُسے نصب العین کے بارے میں بے راہ رو بنایا گیا۔ پیپلز پارٹی کا دلپسند نعرہ: اسلام ہمارا دین ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے اور اشتراکیت ہماری معیشت ہے، پریشان فکری کے علاوہ اور کس چیز پر دلالت کرتا ہے۔ اس نعرے میں "اسلام ہمارا دین ہے" کو اس لیے شامل کیا گیا کہ پاکستان کے اندر خالص الحاد کی کوئی دعوت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس جزو کا مقصد صرف اسی قدر تھا کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو اپنے ساتھ شامل کیا جائے۔ ہمارے ملک کے سابق فرمانرواؤں کی پیہم غلطیوں کی وجہ سے چونکہ اشتراکیوں کو جدید تعلیم یافتہ حلقوں کے اندر نفوذ کے راستے میسر آ چکے تھے اور اس بنا پر وہ بڑے جارحانہ انداز میں بعض طبقوں کے اندر سوشلزم کا پرچار کرنے میں مصروف تھے، اس لیے اُن کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی غرض سے اشتراکیت ہماری معیشت کی صدا بلند کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملحدانہ افکار و نظریات رکھنے والے افراد جو برسوں کی سر توڑ کوششوں کے باوجود مسلم معاشرے میں عزت و احترام کا کوئی مقام حاصل نہ کر سکے تھے، وہ دیکھتے دیکھتے اس "سہ رنگی" جماعت کے قائدین بن گئے۔ پھر جب مسلم طبقوں کی طرف سے اس اجتماع نقیضین پر اعتراض کیا گیا تو عوام کو دھوکہ دینے کی غرض سے یہ کہا جانے لگا کہ اشتراکیت سے ہماری مراد اسلامی اشتراکیت ہے اور یہ اصطلاح مساوات محمدی کے ہم معنی ہے۔ یہ اور اس نوعیت کی دوسری فریب کاریوں سے حصولِ اقتدار کا مقصد تو بلاشبہ حل ہو گیا لیکن اس سے قوم کو جو عظیم نقصان پہنچا ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستانی قوم جس کی بہت بڑی اکثریت اسلامی نظام کے قیام کو اپنا واحد نصب العین قرار دے چکی تھی اور جس کی خاطر اُس نے آگ اور خون کے سمندر میں سے گزرنا گوارا کیا تھا اور پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد بھی اُس نے نصب العین سے انحراف کی ہر کوشش کو پوری قوت کے ساتھ روکنے کی کوشش کی تھی، اس نصب العین ہی کے بارے میں پریشان فکری کا شکار ہو گئی اور جو کام اس ملک کے سوشلسٹ، کمیونسٹ اور دوسرے ملحد عناصر برسوں کی تگ و دو کے بعد بھی کرنے میں ناکام رہے تھے وہ پیپلز پارٹی کی گمراہ کن نعرہ بازی کی وجہ سے بڑی تیزی کے ساتھ سرانجام پائے۔

حصولِ اقتدار کی جدوجہد تک تو یہ متضاد عناصر وسیع اختلافات کے باوجود حکمرانی کے لالچ میں ایک دوسرے کے ہمرکاب رہے مگر جب حکومت پر قبضہ ہو گیا تو اُن میں سے ہر عنصر نے نہایت بلند آواز میں اپنی اپنی بولی بولنا شروع کی اور ذاتی مفادات اور گروہی تعصبات اور نظریاتی تقاضوں کو سامنے رکھ کر

اُمورِ مملکت کو چلانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے، چنانچہ چند ماہ بھی گزرنے نہ پائے کہ زندگی کے ہر شعبے میں تشدید انتشار رونما ہوا جس کے نہایت رُوح فرسا اور بھیانک مناظر آج جگہ جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں اس وقت اُمورِ مملکت کی باگ ڈور ہے وہ افراتفری کے اس عالم کو اپنے حق میں مفید سمجھتا ہو اور اس انداز پر سوچ رہا ہو کہ مختلف طبقوں کی باہمی آویزش اور سر پھٹول اس کے عہدِ اقتدار کو طول دے سکتی ہے لیکن اسے اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے کہ کسی ملک میں انارکی کا وجود اُس ملک کی آزادی کے لیے شدید خطرے کا باعث ہوتا ہے۔

(بقیہ مطبوعات)

اُن میں سے کوئی چیز بھی اُن کے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفہیم القرآن کی مختلف جلدوں کے مطالعہ سے جو کچھ انہوں نے اخذ کیا ہے اسے مختصراً اپنی زبان میں بیان کر دیا ہے۔ کتاب میں مختلف آیات قرآنی کے جو تراجم درج کیے گئے وہ بھی تفہیم القرآن سے نقل کیے گئے۔

کتاب عام مسلمانوں بالخصوص نوجوان طلبا کے لیے مفید ہے اور تفہیم القرآن کے بالاستیعاب مطالعہ کی تمہید بن سکتی ہے۔

کتابت اور طباعت گوارا ہے۔

تبدیلیٔ فون نمبر

سابقہ		موجودہ
۵۷۷۰۶	———	۴۱۱۰۱۶
۵۲۵۰۷	———	۴۱۱۰۱۷

ناظم ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ۔ لاہور